اسلامی شخصی قوانین

ایک مذاکرہ

[اس سال کے شروع میں مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس کا چھبیسواں اجلاس نئی دہلی میں منعقد ہوا تھا۔ اس اجتماع میں ایک مجلس مذاکرہ مندرجہ بالا موضوع پر ہوئی۔ کانگریس کی مفصل روئداد کی اشاعت تو دیر سے ہوگی۔ لیکن خوش قسمتی سے دہلی کے قدیم موقر علمی رسالہ "جامعہ" نے اپنی ایک اشاعت خاص اس کانگریس کے لئے وقف کردی ہے۔ ہم اس موضوع سے متعلق اقتباس اور مضامین درج ذیل کر رہے ہیں۔ مدیر]

(۱)

دوسرا سمپوزیم CHANGES IN MUSLIM PERSONAL LAW کے موضوع پر تھا۔ اس کے صدر مرکزی وزیر تعلیم مسٹر چھاگلہ تھے اور سکرٹری پروفیسر محمد مجیب، اس کے خاص مقررین حسب ذیل تھے۔

(۱) مولانا سعید احمد اکبرآبادی (علی گڑھ)

(۲) ہز ایکسیلنسی مسٹر سیف اللہ اسین (سفیر ترکی)

(۳) ہز ایکسیلنسی مسٹر احمد حسن الفقیہہ (سفیر متحدہ عرب جمہوریہ)

(۴) مسٹر میر اقبال حسین (بنگلور)

(۵) پروفیسر سید حسین نصر (ایران)

(۶) پروفیسر اینڈرسن (لندن)

جناب صدر نے اپنی مختصر افتتاحی تقریر میں اس کی وضاحت کی کہ زیر بحث موضوع کی اہمیت اس لئے بہت زیادہ ہے کہ اس کا تعلق ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں سے ہے، لہٰذا یہ بات صاف ہو جانی چاہئے کہ پرسنل لا کی کیا حدود ہیں، اُن معاملات کے علاوہ جن کا تعلق خاص طور پر ذاتی عقیدہ اور اس کے متعلقہ اعمال سے ہے، فرد کی زندگی کے ہر مسئلہ کا اثر سماج اور ریاست پر پڑتا ہے، ہندوستان سیکولر ریاست ہے اس لئے ان قوانین پر کسی کمیونٹی کو اعتراض نہیں ہونا چاہئے جو فلاح عامہ کے پیش نظر وضع کئے جائیں، ایسے قوانین اور عدالتی فیصلے پہلے ہی سے موجود ہیں جن کی بنا پر مسلم پرسنل لا میں بڑی تبدیلی ہو گئی ہے اور آج بھی ہو رہی ہے، اس لئے یہ نقطۂ نظر کہ یہ پرسنل لا مقدس ہے اور اس میں کوئی مداخلت نہیں کی جا سکتی، صحیح نہیں ہے، آخر میں انہوں نے کہا کہ جہاں تک پرسنل لا کا تعلق ذاتی عقیدہ سے ہے، اس میں کوئی مداخلت نہیں ہونا چاہئے باقی اور معاملات میں پارلیمنٹ کو یہ طے کرنے کا حق ہے کہ مجموعی طور پر قوم کے حق میں کیا چیز مفید ہے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے دین اور شریعت کے فرق کو واضح کیا اور بتایا کہ شریعتیں بدلتی رہی ہیں، انہوں نے امام ابو یوسف رح کی یہ رائے نقل کی کہ جو شخص اپنے زمانے سے واقف نہیں ہے وہ شریعت کے معاملات میں رائے دینے کا اہل نہیں، انہوں نے منصوص اور غیر منصوص کے فرق کو بھی واضح کیا اور اس کی تائید کی کہ غیر منصوص معاملات میں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے بشرطیکہ وہ اجتہاد قرآن اور سنت کے خلاف نہ ہو، مولانا کی یہ رائے تھی کہ مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کے اہل صرف حضراتِ علماء ہیں۔

ترکی اور متحدہ عرب جمہوریہ کے سفیروں نے اپنے اپنے ملک میں مسلم پرسنل لا میں تبدیلیوں کا ذکر کیا، سفیر ترکی نے کہا کہ حالات کے ساتھ یہ تبدیلیاں آئیں، ترکی کی نیشنل اسمبلی کی رائے کی وہی حیثیت قرار پائی جو 'اجماع' کی ہے، انہوں نے فرمایا کہ جو تبدیلیاں ہوتی ہیں وہ قرآنی تعلیمات اور انصاف و مساوات کے اصولوں کے مطابق ہوتی ہیں۔ سفیر متحدہ عرب جمہوریہ نے بتایا کہ مصر میں پرسنل لا سے متعلق جو قوانین بنائے گئے ہیں وہ قرآن و سنت کے مطابق ہیں۔ ہم لوگوں نے یہ طریقہ کار اختیار کیا کہ چاروں مذاہب (حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی) اور شیعہ امامیہ فقہ کے اصولوں کو پیش نظر رکھا اور فلاح عامہ کے تحت جہاں جو بات

معقول ملی اسے لے لیا، انہوں نے اس کی کئی مثالیں دیں اور ثابت کیا کہ جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ شریعت کے حدود میں ہیں۔ میر اقبال حسین نے پورے طور پر انصاف و استحسان کے اصول پر تبدیلی کی حمایت کی، سید حسین نصر نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ مسلم پرسنل لا میں ہم جن تبدیلیوں کے خواہاں ہیں وہ کہیں اس لئے تو نہیں ہیں کہ ہم مغرب سے مرعوب ہیں اور اس کی تقلید کرنا چاہتے ہیں، اس کا عام چرچا ہے کہ قانون کو زمانہ کے ساتھ چلنا چاہئے، اگر یہ بات ہے تو پھر زمانہ کس کے ساتھ چلے گا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ کیا اصول ہے جس کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہئے، اسلام میں کوئی لا پرسنل لا نہیں ہے، اس لئے کہ اسلام افراد اور سماج میں کوئی فرق نہیں کرتا، یہ بات عیسائیت کے لئے تو آسان تھی کہ وہ جب چاہے اپنے لئے قانون وضع کرلے کیونکہ عیسائی مذہب میں شریعت کا کوئی تصور نہیں ہے، لیکن اسلام کے لئے یہ اتنا سہل نہیں ہے۔ پروفیسر اینڈرسن نے پروفیسر نصر کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا اور اسلامی ملکوں کے قوانین میں جو تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں ان پر بڑی تصریح کے ساتھ روشنی ڈالی اور اس کی حمایت کی کہ فلاح عامہ کے اصول کے تحت اسلامی ملکوں میں تبدیلیاں ہوئی ہیں اور ہونی چاہئیں۔

(۳)

شرعی قانون کی تبدیلی

پروفیسر محمد مجیب

زندگی کے نظام کو قائم رکھنے کے لئے قانون کا سہارا چاہئے۔ یہ عالموں کا مانا ہوا ایک اصول ہی نہیں ہے، اس کے بغیر واقعی سماجی زندگی میں کوئی استقلال پیدا نہیں ہوسکتا۔ لیکن تاریخ اس کی شاہد ہے کہ حالات بدلتے رہتے ہیں، نئی ضرورتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں اور قانون میں اسی رفتار سے ترمیم نہ ہوتی ہے اور نہ ہوسکتی ہے، اس لئے کہ تبدیلی کے بارے میں یقین اسی وقت ہوسکتا ہے جب اس سے متاثر ہونے والے لوگوں کی تعداد کافی ہو جائے اور قانون کے نہ بدلنے سے جو نقصان ہو رہا ہو۔ وہ ثابت کیا جاسکے۔ یہ ہے ان قوانین کا مسئلہ جو حکومت وقت کی تحریک پر یا اس کے توسط سے یا اس کے حکم سے بنتے ہوں۔ اگر قانون کی بنیاد مذہبی عقائد پر ہو اور اس کی سند

دینی کتابوں سے دی جاتی ہو تو معاملہ اور مشکل ہو جاتا ہے، اس لئے کہ عقائد کی طرح عقائد پر منحصر قوانین وقت کے ساتھ بدل دئے جائیں تو عقیدے اور قانون دونوں کی حیثیت بدل جاتی ہے۔

خالص تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کے شرعی قانون اصولاً برابر نافذ رہے مگر عملاً حاکموں نے دنیاوی معاملات میں جو جی چاہا کیا بادشاہوں نے آمدنی کے طریقے نکالے، سزائیں دیں اور بہت سے ایسے کام کئے جن کی شریعت اجازت نہیں دیتی اور جن کی جانچ کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ صرف قانون ہی نہیں بلکہ اسلامی عقائد اور اخلاق کے بھی خلاف تھے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تو ظاہر ہے شریعت کا نفاذ حکومت کے ذمے نہیں رہا اور صرف چند معاملات میں، جو انفرادی حقوق یا پرسنل لا کے ضمن میں آتے ہیں عدالتوں نے اس کی رعایت رکھی کہ پرانا قانون رسم سمجھ کر برتا جائے۔ اس وقت یہ معلوم ہوا کہ انفرادی حقوق یعنی پرسنل لا کے ایک اہم شعبے میں جس کا تعلق وراثت سے ہے، ہندوستانی مسلمانوں کی رسمیں شرعی قانون کے خلاف پڑتی ہیں اور انگریزوں نے نہیں بلکہ خود مسلمانوں نے اصرار کیا کہ عدالت شریعت کے بجائے رسم کے مطابق فیصلے کرے۔ اس کی سب سے نمایاں مثال پنجاب اور یو پی کے زمینداروں کی رسم تھی کہ لڑکی کو جائداد ورثے میں نہ ملے اور لڑکوں میں بھی سب سے بڑے لڑکے کو وراثت اور باقی کو صرف گذارے کا حق دار مانا جائے۔ اس کے علاوہ برطانوی حکومت نے جو قانون بنائے اور خاص طور سے قانون تعزیرات میں اسلامی شریعت کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔

یہ خیال غلط ہے کہ حکومت کے قانون اپنی جگہ اور شریعت کے قانون اپنی جگہ نافذ سمجھے جاسکتے ہیں۔ شریعت کے قانون زندگی اور معاملات کے ہر پہلو پر حاوی ہیں اور حکومت کے قانون بھی لامحالہ زندگی اور معاملات کے ہر پہلو پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ انگریزی حکومت نے عبادات کے میدان میں دخل اندازی نہیں کی، لیکن یہ مسئلہ کافی شدید اختلافات اور فسادات کے بعد طے ہوا کہ اگر مسجد سڑک میں آجائے تو سڑک کو الگ ہٹا کر بنانا چاہئے۔ یا مسجد یا اس کے کسی حصے کو گرا دینا چاہئے۔ مسلمان اس خوش فہمی میں رہے کہ انھیں مذہبی آزادی حاصل ہے اور شریعت کے قانون میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا رہی ہے، جبکہ حقیقت یہ تھی کہ حکومت کی تحریک سے فتویٰ حاصل کیا جاسکتا تھا کہ

ہندوستان دارالامن ہے اور معاملات سے متعلق شریعت کا کوئی قانون نہیں تھا جسے بناتے وقت علماء سے مشورہ کیا گیا ہو یا شرعی قانون سامنے رکھا گیا ہو۔ انگریزی حکومت کی مصلحت اندیشی تھی کہ اس نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ شرعی قانون میں تبدیلی کرنے کی مجاز ہے اور ایسی کسی اصلاح کی کوشش نہیں کی جس کی مخالفت مسلمانوں کا کوئی طبقہ دین اور شریعت کا حوالہ دیکر کرسکتا۔

جس کسی منظم ریاست میں قانون بنتے ہیں تو یہ واضح اور مسلّم ہوتا ہے کہ قانون بنانے یا بنے ہوئے قانون میں تبدیلی کرنے کا اختیار کس کو ہے۔ شرعی قوانین میں تبدیلی کرنے کا کوئی ایسا طریقہ نہیں ہے۔ جس کے مستند ہونے کے بارے میں مسلمان متفق ہوں۔ اجتہاد اور اجماع بحث کی خاطر تو تبدیلی کرنے کے ذریعے مانے جاسکتے ہیں، لیکن نہ تو اجتہاد کرنے کا حق کسی کو واضح طور پر دیا گیا ہے اور نہ اس کی حدود مقرر کی گئی ہیں۔ اجماع کی صورت کیا ہوسکتی ہے اس کا طے کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ علماء کو تمام مسلمانوں کا نمائندہ رسماً یا احتراماً مان لیا جائے تب بھی یہ معاملہ رسم اور احترام کا ہوگا، واضح قانون کا نہ ہوگا۔ ویسے اعتراض کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ آج کل صحیح معنی میں عالم اسی کو مانا جاسکتا ہے جو صرف دینی علوم میں ہی نہیں بلکہ دنیاوی علوم اور خاص طور پر اجتماعیات اور علم قانون میں ملکہ رکھتا ہو۔ یہ شرط ان لوگوں کو جمع کرکے پوری نہیں کی جاسکتی جن میں سے کچھ دینی علوم سے اور کچھ دنیاوی علوم سے واقفیت رکھتے ہوں دودھ، چاول اور شکر کو ملاکر کھیر نہیں بنتی، اس کے لئے ہانڈی اور آگ بھی چاہئے اور وہ مدت کہ جو ان تینوں اجزا کو ملاکر ایک مزہ پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے۔

اس وقت اگر دیکھا جائے تو یہ بات بالکل ثابت ہے کہ شرعی قوانین میں تبدیلی کرنے کا حکومت کو حق نہیں ہے، اگرچہ مستشرقین کی کانگریس میں جو سیمینار ہوا تھا اس میں چھاگلہ صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ سیکولر ریاست کی پارلیمنٹ انصاف اور عام مفاد کی خاطر ہر قسم کا قانون بنانے کی مجاز ہے، صرف عقائد کے معاملے میں اس کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس رائے کو ثابت کرنے کے لئے چھاگلہ صاحب نے دلیل یہ دی تھی کہ حکومت معاشی اور سیاسی معاملات سے متعلق قوانین بنانے کی مجاز ہے اور اس سے بہرحال انفرادی حقوق پر اثر پڑتا ہے اور جب کوئی ایسا معاملہ جس کا تعلق ان انفرادی حقوق سے ہو جو شریعت کے مطابق دیئے گئے ہیں، عدالت میں پیش ہوتا ہے تو جج کا فیصلہ لامحالہ شرعی قانون میں اضافہ یا ترمیم کرتا ہے۔ شاید اسی خیال سے کہ قاضی کا فیصلہ اضافہ یا ترمیم نہ کرسکے شریعت میں کسی معاملہ کا فیصلہ اسی قسم

کے دوسرے معاملات کے لئے سند نہیں مانا گیا ہے)۔ اسی سیمینار میں مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی نے یہ رائے دی کہ علماء قانونی معاملات میں "اولوالامر" کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ ہو سکتا ہے کہ وہ وزارت قانون کے اشتراکِ عمل سے اس پر غور کریں کہ کن خاص معاملات میں شرعی قانون پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

اسی سیمینار میں ترکی کے سفیر سیف اللہ ایسن اور مصر کے سفیر احمد حسن الفقیہہ کے بیانات سے معلوم ہوا کہ اگر کسی ایک فقہی مذہب کی پابندی کرنے کے بجائے چاروں مذاہب کے اصولوں کو سامنے رکھا جائے تو بہت سی ضروری اصلاحیں کی جا سکتی ہیں۔ مصر میں چاروں مذاہب کے علاوہ شیعی مذہب کے اصول بھی سامنے رکھے گئے اور اسی طرح یہ معلوم ہوا ہے کہ مختلف مذاہب کے دائرے سے نکلے بغیر ایسے اصولوں کو قانون کی شکل دی جا سکتی ہے جو انفرادی حقوق کے دائرے کو اتنا ہی وسیع کر دیں جتنا کہ وہ دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں ہے۔

ضروری اصلاحوں سے کیا مطلب ہے یہ چند مثالوں سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں بیوہ کی شادی کا رواج بند ہو گیا تھا اور اتنے عرصے تک بند رہا تھا کہ اس کی ممانعت کو ایک شرعی قانون کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ سید احمد شہید رح نے ضروری سمجھا کہ بیوہ کو اس کا حق دیا جائے اور اس حق کو دلانے کے لئے خود ایک بیوہ سے شادی کی اور اپنے ان ساتھیوں کو جن کی شادی نہیں ہوئی تھی ہدایت کی کہ بیوہ سے شادی کریں۔ اس اصلاح کی ضرورت ایک اعلیٰ شخصیت کے ضمیر نے محسوس کی اور اس کے خلاف یہ کہنا کہ بیوہ عورتیں خود نہیں چاہتی ہیں کہ دوبارہ نکاح کریں۔ یا یہ کہنا کہ بیوہ عورتوں کی نمایاں تعداد نے اس کا مطالبہ نہیں کیا ہے بالکل غلط ہے۔ دوسری قسم کی مثالیں وہ ہیں جو احمد حسن الفقیہہ صاحب سفیر مصر نے اپنی تقریر میں پیش کیں۔ مصر میں عدت کا زمانہ تین سال تھا۔ شوہر مفقود الخبر ہو جاتا تو بیوی انتظار میں عمر بھر بیٹھی رہتی۔ شوہر کے لئے طلاق دینا آسان تھا اور خاص حالات کی وجہ سے جو شوہر قانونی رعایت سے فائدہ اٹھا رہے تھے ان کی تعداد اتنی بڑھ گئی تھی کہ بیوی کے حق کا تحفظ نہیں ہو سکتا تھا۔ عورتوں میں تعلیم پھیلی تو یہ لازمی بات تھی کہ رائج قانون کے خلاف احتجاج کریں۔ اس کے علاوہ مسلمانوں اور ان کے طریق زندگی پر اعتراض کرنے والے بہت تھے اور اعتراض کا کوئی معقول جواب نہیں دیا جا سکتا تھا۔ ترکی میں سنہ ۱۹۱۱ء سے جو لڑائیاں شروع ہوئیں تو انہوں نے مردوں کی آبادی اتنی کم کر دی کہ اگر عورتیں پردے میں بیٹھی رہتیں یا انہیں وراثت کا اور اپنی جائداد کا خود انتظام کرنے کا حق نہ ملتا تو ترک بالکل

تباہ ہوجائے۔ ایسی صورتوں میں یہ بحث چھڑنا لازمی ہے کہ جس قاعدے یا قانون کی پیروی یہ سمجھ کر کی جارہی ہے کہ وہ شریعت کا حکم ہے وہ واقعی حکم ہے یا نہیں اور اگر ان سوالات کا جو کئے جارہے ہوں کوئی معقول جواب نہ دیا جائے تو افراد پھر زچ ہوکر شریعت کے دائرے سے بالکل ہی نکل جانے کا فیصلہ کرنے لگتے ہیں جیسے اس صدی کے شروع میں پنجاب کی عورتوں نے ان حقوق سے محروم رکھے جانے پر جو اسلام نے ان کو دئے تھے۔ عیسائی مذہب قبول کرنا شروع کردیا تھا۔ یہ کہہ دینا کہ ایسے لوگ بہرحال کم ہوں گے مسئلے کو ٹالنا ہے اور اس سے ایسا نقصان ہوسکتا ہے کہ جو اصولی اعتبار سے بہت اہم ہو

اس سیمینار میں سید حسین نصر ایک ایرانی فاضل کی تقریر بہت فکر انگیز تھی۔ انھوں نے بہت اصرار سے کہا کہ شریعت کو دین اور معاملات دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ جیسے انسان کو جسم اور روح دو حصوں میں الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اسلامی شریعت جسم اور روح کے اتحاد و اتصال کا نمونہ اور احکام الٰہی کا مجسمہ ہے، ہم جن مادی حقائق کو سامنے رکھ کر شریعت کو جانچتے ہیں وہ حقیقت کا صرف ایک رخ ہے، ایسا رخ جو بدلتا رہتا ہے اور قابل اعتبار نہیں ہے۔ یہ کہنا بھی مہمل ہے کہ قانون کو وقت کے ساتھ قدم بہ قدم چلنا چاہئے کیونکہ اس کے بعد پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وقت کس کے ساتھ چلتا ہے اور اس کو چلانے والا کون ہے۔ دراصل شریعت کو عقائد اور معاملات دو حصوں میں کرنا عیسائیوں کی تقلید میں شروع کیا گیا۔ عیسائی مذہب میں کوئی شریعت نہیں ہے، یہ پوری پوری رومی قانون سے ماخوذ ہے، اس لئے عیسائیوں میں قانون کی حیثیت ضمنی اور اتفاقی ہے اور دراصل اس کا دین سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اب اسی بات کو سامنے رکھ کر مسلمانوں سے کہا جاتا ہے کہ جیسے عیسائی ملکوں نے اپنا قانون بدلا ہے ویسے ہی وہ بھی اپنی شریعت کو بدلیں۔ یہ مطالبہ یورپ اور امریکہ کی نقل کے خاطر کیا جاتا ہے۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہم تعدد ازدواج کو برا سمجھیں اس لئے کہ یورپ اور امریکہ میں اس کو برا سمجھا جاتا ہے اور ہم میں احساس کمتری اس درجہ پر پہنچ گیا ہے کہ ہم اسے بلا تامل مان لیتے ہیں۔ عیسائی مذہب کے طریقہ کار اور یورپ و امریکہ کے رواج کی نقل کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ریاست اخلاقی حاکم بھی بن جائے گی اور اس کے مقابلے میں شریعت کیا قرآن کی بھی کوئی حیثیت نہیں رہ جائے گی۔ لیکن یہ سب کہنے کے بعد سید حسین نصر نے یہ بھی کہا کہ ایران میں علما کے مشورہ سے اور نپولین کے مجموعۂ قانون کو سامنے رکھ کر احکام مدنیہ مرتب

کئے گئے ہیں۔ یعنی ایران میں اسی طرح انفرادی حقوق میں تبدیلیاں کی گئی ہیں جیسے کہ ترکی اور مصر میں اور طریق کار بھی وہی اختیار کیا گیا ہے جو ان ملکوں میں۔ اب اگر ترکی میں یہ مان لیا گیا ہے کہ قومی اسمبلی کا فیصلہ اجماع کی حیثیت رکھتا ہے اور اس طرح قومی حکومت کو قانون بنانے کا پورا اختیار دیدیا گیا ہے تو اس سے حسین نصر صاحب کو بھی اختلاف نہیں کرنا چاہیئے۔

دراصل جو حقیقت ہے اسے نظر میں رکھیں تو بحث مختصر کی جا سکتی ہے۔ اس وقت ہندوستان میں شریعت کو نافذ کرنا تو درکنار شرعی مسائل کے متعلق رائے دینے کا اختیار بھی کسی شخص یا جماعت کو نہیں ہے اور فتویٰ حاصل کرنے کا پرانا طریقہ معاملوں کو طے کرنے کے بجائے خود علماء میں فساد پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی کوئی ایسی دینی تنظیم بھی نہیں ہے کہ جس کے ذریعہ افراد پر اثر ڈالا جا سکے اور صحیح اور غلط طریقۂ کار کے بارے میں فیصلے کئے جا سکیں۔ مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت خود ان کی مرضی سے قائم ہے اور اگرچہ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس میں استقلال اسی وجہ سے ہے لیکن اس صورت حال کے سبب سے یہ لازمی ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں میں جو اہل فکر ہوں وہ نئے سماجی رجحانات کا اندازہ کرتے رہیں اور جن مسائل کی اصولی حیثیت ہو ان میں افراد کی رہنمائی کی صورتیں نکالتے رہیں۔ عیسائی دنیا میں ہر جگہ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں کے درمیان مخالفت ہے۔ پروٹسٹنٹ لڑکی کسی رومن کیتھولک لڑکے سے شادی کرلے تو وہ فرقے سے خارج سمجھی جا سکتی ہے اور اگر رومن کیتھولک لڑکی پروٹسٹنٹ سے شادی کرلے تو رومن کیتھولک کلیسا کی طرف سے اس کو اجازت مل سکتی ہے، اس شرط کے ساتھ کہ اولاد رومن کیتھولک ہوگی، اس طرح لڑکی کلیسا کے اثر میں رہتی ہے اور رومن کیتھولک جماعت میں اگر ایک فرد کی کمی ہو جاتی ہے تو نئے افراد کے اضافے کا امکان بھی پیدا ہو جاتا ہے اور ایک کارروائی جو فی نفسہٖ مناسب نہیں مانی گئی ہے غیر قانونی نہیں ہو جاتی ہے۔ اس وقت ہندوستان میں مختلف مذہبوں کے لوگوں میں شادی بیاہ کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ ہم چاہیں تو اس بات کو بالکل نظرانداز کر سکتے ہیں کہ مسلمان لڑکیاں ہندوؤں سے شادی کرتی ہیں، چاہیں تو اس کا کوئی انتظام کر سکتے ہیں کہ قانون کی خلاف ورزی سے جماعت کو کم سے کم نقصان ہو۔ اگر ان لوگوں کو جو اپنے آپ کو ایسا طریقہ اختیار کرنے پر مجبور پاتے ہیں جس کی رعایت شرعی قانون نے نہیں رکھی ہے تو وہ رائج سرکاری قانون سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ

شرعی قانون عملاً منسوخ ہوجائے۔ ربا کی جو بحث ہے اس کا ایک نتیجہ یہ ہوسکتا ہے کہ لوگ علماء کی رائے پر منافع کو ترجیح دیں۔ جن لوگوں کو شرعی قانون کا احترام اور اس کا زیادہ سے زیادہ نفاذ جاری رکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے، انھیں کسی کی تحریک کے بغیر بھی سوچنا چاہیئے کہ اب تک کن کن شعبوں اور معاملوں میں شرعی قانون کا نفاذ بالکل نہیں رہا ہے اور جن شعبوں اور معاملوں میں ہے۔ ان لوگوں کو اسے نافذ رکھنے پر کسی طرح آمادہ کیا جاسکتا ہے۔ ان لوگوں کو اسے نافذ رکھنے پر کس طرح آمادہ کیا جاسکتا ہے۔ حکومت ہند کی طرف سے اگر اعلان کردیا جائے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کے شرعی قانون میں تبدیلی کرنے کی مجاز نہیں سمجھتی اور اس کا عمل اس اعلان کے مطابق رہے تب بھی اصل صورت حال میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔

(۳)

مسلم پرسنل لا پر نظر ثانی

عبداللطیف اعظمی

مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس میں اسلامی قانون کے ماہرین بھی دنیا کے مختلف حصوں سے بہت بڑی تعداد میں آئے تھے۔ اس لئے اس اہم موقع پر مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کے مسئلہ پر سمپوزیم کا انتظام ضرورت اور محل کے لحاظ سے عین مناسب تھا۔ کانگریس کی مختلف کارروائیوں پر جو سرسری تبصرہ اس شمارہ میں شائع کیا جارہا ہے اس میں مسلم پرسنل لا پر بحث و گفتگو کا خلاصہ بھی درج ہے۔ اس خلاصے میں اگرچہ تفصیل اور وضاحت نہیں ہے، مگر اس سے مقررین اور مقالہ نگاروں کی رایوں اور ان کے رجحانات کا بہر حال بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے اس بحث کے اختتام پر صدر جلسہ جناب محمد کریم چھاگلہ صاحب نے بالکل صحیح فرمایا تھا کہ سوائے ایک مقرر (پروفیسر سید حسین نصر) کے سب نے اس سے اتفاق کیا کہ مسلم ممالک میں حسب ضرورت تبدیلیاں کی گئی ہیں اور ضرورت کے مطابق کی جانی چاہئیں۔

ہندوستان میں یہ مسئلہ چند ماہ قبل حکومت کے سامنے آیا تو علماء اور مذہبی اور نیم مذہبی اخبارات و رسائل کی طرف سے شدید اعتراضات کئے گئے کہ یہ مسلمانوں کا خالص مذہبی مسئلہ ہے جس میں حکومت کو ازروئے دستور مداخلت کا اختیار حاصل نہیں۔ اسی کے ساتھ یہ واقعہ بھی ہے کہ سنجیدہ رسالوں اور روشن

خیال علماء نے موجودہ مسلم پرسنل لا پر نظر ثانی کی ضرورت کا اعتراف کیا اور لکھا کہ زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ضروری تبدیلی کرنا ازبس ضروری ہے اس احساس کے زیر اثر دار العلوم ندوۃ العلماء نے منتخب علماء کی ایک کمیٹی مقرر کی اور اس نے کافی کام کر بھی لیا ہے، مگر ابھی زیر تکمیل ہے اس لئے اس کے متعلق کسی قسم کا اظہار خیال قبل از وقت ہوگا، مگر اخبارات و رسائل کے ذریعہ ہندوستان کے علماء کے جو افکار و خیالات سامنے آئے ہیں ان کے پیش نظر کسی بہتر تبدیلی کی امید نہیں کی جا سکتی۔ علماء دین اپنی بحثوں اور بیانوں میں سب سے زیادہ زور اس پر زور دیتے ہیں کہ اس معاملۂ خاص میں پارلیمنٹ کو کوئی قانون بنانے یا مروجہ قوانین میں ترمیم کرنے کا کوئی اختیار نہیں، بلکہ اس کا حق صرف علمائے اسلام کو ہے یہ کہتے وقت وہ اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ قانون تو بہر حال صرف پارلیمنٹ ہی بنا سکتی ہے[1]۔ دوسرے شرعی قوانین کے لئے صرف دین اور سنت سے واقفیت کافی نہیں ہے، زمانے کی ضروریات و مسائل سے گہری واقفیت بھی ضروری ہے، جیسا کہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب نے اس سمپوزیم میں امام ابو یوسفؒ کے حوالے سے فرمایا تھا۔

ترکی اور متحدہ عرب جمہوریہ کے سفیروں نے اگرچہ اپنے مقالوں میں یہ بات پوری وضاحت سے کہی تھی کہ ان دونوں ملکوں میں مسلم پرسنل لا میں پارلیمنٹ کے ذریعے تبدیلیاں کی گئی ہیں مگر عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ان ملکوں میں بھی اسلامی قوانین میں جملہ تبدیلیاں علمائے دین کے مشورہ اور ان کی رائے کے مطابق کی گئی ہیں۔ مگر یہ کہتے وقت یہ حقیقت نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ ان مسلم ملکوں کے علماء اور ہندوستان کے علماء کے خیالات اور تصورات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جن جدید افکار اور مغربی تصورات کو مصری، بغدادی اور ترکی علماء نے عرصہ ہوا قبول کر لیا ہے، ہمارے ہندوستان و پاکستان کے علماء ابھی ان کی حلت و حرمت کی بحث میں ہی الجھے ہوئے ہیں۔ ابھی حال میں ندوۃ العلماء کے ایک عربی رسالہ میں

---

[1] مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے نزدیک اسلامی معاشرہ کے لئے قانون بنانے کے مجاز "اولوالامر" ہیں اور اولوالامر کی وضاحت موصوف نے اس طرح کی ہے۔ "اولوالامر سے مراد حکومت اور علماء دونوں ہیں، ایک کے پاس نفاذ کی قوت ہے اور دوسرے کے پاس وضع قانون کی اور اصلاح دونوں کے ملنے سے ہی ہو سکتی ہے تنہا کوئی ایک گروہ اس کو انجام نہیں دے سکتا۔" (برہان بابت ماہ اگست ۶۳ء صفحہ ۶۸)

فنونِ لطیفہ کے متعلق کوئی مضمون شائع ہوا تھا۔ اس کے جواب میں ازہر یونیورسٹی کے ایک جید عالم دین نے لکھا تھا کہ اس ترقی یافتہ دور میں کوئی باہوش آدمی فنون لطیفہ کو حرمت و حلت کی بحث کا موضوع نہیں بنا سکتا چاہے وہ ندوہ کا عالم ہی کیوں نہ ہو۔ ہمارے ایک عالم دین کو یہ بات اتنی ناگوار گذری کہ علالت کے باوجود جب تک اس کی تردید میں ایک زوردار مقالہ نہیں لکھ لیا ان کو چین نہیں آیا۔ اسی سے دوسرے مسائل کے متعلق ان علمائے کرام کی رایوں اور ان کے خیالات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک مسلم روزنامے نے زیر بحث سمپوزیم کے صدر جناب چھاگلہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ایک اچھے ماہر قانون ہو سکتے ہیں مگر ان کو مذہبی علوم میں کوئی درک نہیں ہے اس لئے وہ مسلم پرسنل لا میں کسی تبدیلی یا عدم تبدیلی کے متعلق کچھ کہنے کے مجاز نہیں ہیں۔ لیکن یہ لکھتے وقت معاصر مذکور کو خیال نہیں رہا کہ ایسا ہی سوال علمائے دین سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ دینی علوم کے بیشک وہ عالم اور ماہر ہیں مگر اقتصادیات و معاشیات کے جدید اصولوں اور نظریوں بنک اور تجارت کے مغربی طریقوں، سوشلزم اور کمیونزم کے پیدا کردہ مسائل وغیرہ سے بخوبی واقف نہیں ہیں اس لئے وہ موجودہ سوسائٹی کے تقاضوں اور مطالبوں کے مطابق کوئی قانون بنانے کے اہل نہیں ہیں۔

چھاگلہ صاحب نے اپنی افتتاحی تقریر میں بہت معقول بات کہی تھی کہ مسلم پرسنل لا میں کچھ کا تعلق ہمارے ایمان اور عقیدے سے ہے۔ ایسے معاملات میں پارلیمنٹ کو دخل دینے کا حق نہیں لیکن جن امور کا تعلق روزمرہ سماجی زندگی سے ہے ان کے متعلق بہر حال عوام کے نمائندے اور پارلیمنٹ ہی بہتر فیصلہ کر سکتی ہے۔ یا مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب نے فرمایا تھا کہ دین میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جا سکتی مگر شریعت زمانے اور حالات کے مطابق برابر بدلتی رہتی ہے۔[1] اسی طرح میر اقبال حسین صاحب نے محجوب الارث کے مروجہ قانون کا حوالہ دیکر فرمایا تھا کہ یہ بات کسی طرح قرین انصاف نہیں کہی جا سکتی کہ

---

[1] کن احکام میں تبدیلی ہو سکتی ہے اور کن میں نہیں۔ اس مسئلے پر مولانا اکبر آبادی نے برہان بابت ماہ اگست ۶۲ء کے "نظرات" میں ذرا تفصیل سے بحث کی ہے۔ لکھتے ہیں: "یہ احکام دو قسم کے ہیں، ایک وہ جن کی نسبت نصوص شرعیہ موجود ہیں اور اس بنا پر ان کو فرض، واجب یا حرام و ناجائز کہا جاتا ہے، مثلاً محرمات نکاح وطعام، تقسیم میراث کے قوانین، انعقاد و فسخ نکاح کے شرائط و لوازم، یہ تمام احکام قطعی ہیں اور ان پر ہرگز نظر ثانی نہیں کی جا سکتی

(باقی اگلے صفحہ پر)

ایک شخص کے کچھ پوتے مخصوص حالت میں، وراثت سے محروم کر دئے جائیں اور کچھ پورے ترکہ کے مالک قرار پائیں۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور میر اقبال حسین دونوں نے سوسائٹی کے مفاد میں ایک سے زیادہ شادی پر پابندی لگانے کو حق بجانب اور جائز قرار دیا ہے۔ اسی طرح کے بہت سے مسائل اور معاملات پر اسلامی ملکوں میں پارلیمنٹ کے ذریعہ پابندیاں عائد کی گئی ہیں اور حسب ضرورت کی جاتی ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہی طریقہ ہندوستان میں بھی اختیار نہ کیا جائے۔

اس سمپوزیم میں صرف ایک تقریر ایسی تھی، جسے جذباتی کہا جا سکتا ہے۔ ایران کے ایک پروفیسر، سید حسین نصر صاحب نے پرسنل لا میں تبدیلی کو اندھی تقلید اور اسے بجا مرعوبیت بلکہ احساس کمتری کا نتیجہ قرار دیا۔ موصوف کے نزدیک شریعت کو دینی اور دنیاوی معاملات میں تقسیم کرنا صحیح نہیں ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ اسلام میں پرسنل لا (انفرادی قانون) سرے سے موجود نہیں ہے، کیونکہ اسلام نے افراد اور معاشرہ میں کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ ان کے خیال میں شریعت نے کبھی زندگی کی حقیقتوں کو تسلیم کرنے سے انکار نہیں کیا، اس لئے تبدیلی کا کبھی سوال بھی پیدا نہیں ہوا۔ موصوف کے جذبات اور خیالات سے قطع نظر انھیں شاید اس سمپوزیم کا پس منظر اور مقصد معلوم نہ تھا یا تقریر کے وقت شدت جذبات میں یاد نہیں رہا کہ یہ بحث ہندوستان کے نئے حالات کے پیش نظر شروع کی گئی تھی، جہاں آزادی کے بعد سوسائٹی کی اصلاح و بہتری کے لئے نئے قوانین وضع ہو رہے ہیں، جہاں مسلمانوں کا ایک پرسنل لا پہلے سے موجود ہے، جہاں ایک سیکولر حکومت قائم ہے، جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور جہاں یہ سوال ہے کہ مسلمانوں کے پرسنل لا میں، دوسری سماجی اصلاحات کی طرح، تبدیلی کی جائے یا نہیں، اگر کی جائے کس حد تک اور اس کا طریق کار کیا ہو۔

ان کے مقابلے میں دوسری قسم کے احکام وہ ہیں جن کی نسبت سرے سے کوئی نص شرعی موجود نہیں ہے یا نص موجود ہے مگر اس میں اس بات کی صراحت ہے کہ وہ حکم، فرض، واجب یا حرام نہیں ہے یا نص ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکم کسی خاص علت یا سبب یا حکمت و مصلحت پر مبنی ہے۔ اس صورت میں اگر کبھی علت سبب یا حکمت مصلحت باقی نہ رہے تو حکم خود بخود بدل جائیگا خواہ وہ حکم وقتی وہنگامی طور پر کیسا ہی لازمی اور ضروری گا

ابھی تک اخبارات و رسائل میں مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کے خلاف جتنی باتیں کہی گئی ہیں وہ زیادہ تر جذباتی اور حقیقت پسندی سے دور ہیں۔ ایسے دلائل اور بحثوں سے وقتی طور پر رکاوٹ ڈالی جا سکتی ہے مگر مستقل طور پر نہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ علمائے دین حالات کو سمجھیں اور زیادہ بہتر ہو اگر وہ خود ہی زمانے کے تقاضوں کے مطابق تجاویز مرتب کر کے مسلم رائے عامہ کے سامنے پیش کر دیں۔ مولانا اکبر آبادی نے بہت ہی بروقت اور صحیح مشورہ دیا ہے کہ "علماء وقت کے تقاضوں اور ضرورتوں کا وسعتِ نظر اور روشن دماغی کے ساتھ جائزہ لیں اور ہر چیز کو مداخلت فی الدین کہنے کی عادت ترک کر دیں۔"[1] لیکن اگر انھوں نے یہ عادت نہ چھوڑی اور وقت کی سوئی کو روکنے کی کوشش کی تو انھیں ترکی کے انقلاب سے سبق لینا چاہئے۔ ایک مسلم مبصر اکثر فرمایا کرتے ہیں کہ مسلمان اس قدر روایت پرست واقع ہوئے ہیں کہ ترکی میں عمامے کی جگہ ترکی ٹوپی پہنانے کے لئے گولی چلانی پڑی اور جب اسی ترکی ٹوپی کو اتار کر ہیٹ پہنایا گیا تو اس وقت بھی طاقت استعمال کی گئی۔

---

[1] موصوف نے علماء کے ساتھ حکمران طبقہ کو بھی مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنے فکر و عمل کو اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالے، خود شریعت کے اوامر و نواہی کا پابند ہو اور اپنی طاقت و قوت سے کام لے کر ملک کو منکرات و فواحش سے پاک و صاف کرے۔" (برہان بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۶۳ء صفحہ ۱۳۲) میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ایک سیکولر حکومت کا حکمران طبقہ موصوف کی اس نصیحت پر کیونکر عمل کر سکتا ہے۔